سر سید کا نظریہ تعلیم

مجاہد حسین، اسکالر ایم فل اُردو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور

Abstract

The name of ***Sir Syed Ahmed Khan*** is not dependant on any introduction. He has many favours for the Muslim that can't be forgotton. He established many educational institues and convinced the Muslims about leaving orthodox education and adopting updated and innovative education system. In this article, Sir Syed's educational point of view has been discussed.

سر سید احمد خاں کا نام ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین نام ہے۔ ہندوستان کی شاید ہی کوئی اور شخصیت ایسی ہو جس کے حق اور مخالفت میں اتنا لکھا گیا ہو جتنا سر سید احمد خاں کے حوالے سے لکھا گیا۔ ان کے افکار و نظریات کی حمایت میں لکھنے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کی مخالفت میں لکھنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں۔

سر سید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اور بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔ مسلمانوں کے زوال پر وہ رنجیدہ خاطر تھے۔ ان حالات میں انھوں نے مسلمانانِ ہند کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک طرف تو رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جبکہ دوسری طرف علی گڑھ سکول اور کالج قائم کیے تاکہ مسلم نوجوانوں کو جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جا سکے اور مسلمانوں اور انگریزی حکومت کے درمیان فاصلوں کو کم کیا جا سکے اور ان کے اور انگریزی حکومت کے درمیان باہمی اعتماد کی فضا قائم ہو اور ذہنی ہم آہنگی فروغ پا سکے۔

سر سید احمد خاں نے اس سلسلے میں اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کی تعلیمی اور سیاسی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ اردو نثر اور صحافت کے فروغ کے لیے بھی ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

سر سید احمد خاں کی شخصیت اس وقت متنازعہ بنی جب ان پر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران انگریزوں کا ساتھ دینے کا الزام آیا۔ بعدازاں ان کی سیاسی و مذہبی تحریریں بھی وجہ تنازع بنیں، خصوصاً ان کے مذہبی نظریات کو

علما اور مسلم عوام نے پسند نہ کیا کیونکہ ان کے بہت سے نظریات اسلام کی بنیادی تعلیمات اور نظریات کے مطابق نہیں تھے۔ سرسید کے ان نظریات کی وجہ سے ان پر کفر کے فتوے بھی لگے۔ اسی دور میں جب سرسید نے علی گڑھ میں ایک ادارے کی بنیاد رکھی تو اس کے خلاف بھی ردعمل سامنے آیا، کیونکہ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس ادارے میں مسلم نوجوانوں کو ویسی ہی تعلیم دی جائے گی جیسا کہ سرسید احمد خاں کے اپنے خیالات ونظریات ہیں۔

سرسید کے مذہبی نظریات جو ان کی مختلف تحریروں کی صورت میں سامنے آئے ان کے خلاف فوری ردعمل کی وجہ بنے۔ ہندوستان کے مسلمان دو طبقوں میں بٹ گئے، ایک طبقہ وہ تھا جو سرسید کے حق میں تھا اور دوسرا وہ جو ان کی مخالفت کر رہا تھا۔ ان کے حق اور مخالفت میں لکھنے کا سلسلہ سرسید کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا اور ہنوز جاری ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سرسید احمد خاں کی خدمات کا خوب چرچا ہوا۔ اس سلسلے میں مبالغہ بھی سامنے آیا۔

سرسید کے حامیوں نے اس تاثر کو بھی عام کیا کہ سرسید انگریزی کی بجائے اردو ذریعہ تعلیم کے حامی تھے اور وہ اردو کو ہی ذریعہ تعلیم دلوانے کے لیے کوشاں رہے۔ یہ بات درست ہے کہ سرسید احمد خاں ابتدائی دور میں اردو میں تعلیم کے حامی تھے۔ اور اسی حق میں تھے کہ ہندوستان کے لوگوں کو تعلیم ان کی اپنی زبان میں دی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہندوستان کو شائستگی اور تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا۔ اس حوالے سے سرسید کا کہنا تھا:

> ''اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیئے جائیں تو کبھی ہندوستان کو شائستگی وتربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا۔ یہی سچ ہے، یہی سچ ہے، یہی سچ ہے۔''[۱]

سرسید کے اسی بیان کی بنیاد پر یہ تاثر عام ہوا کہ وہ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں تھے۔ بہت سے لکھنے والوں نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ اس حوالے سے مولوی عبدالحق نے لکھا:

> ''قصرِ پاکستان کی بنیاد میں ''پہلی اینٹ'' اسی پیرمرد (سرسید) کے مبارک ہاتھوں نے رکھی اور وہ اینٹ اردو زبان تھی۔''[۲]

سرسید ابتدا میں مقامی زبانوں یا زبان میں تعلیم کے حق میں تھے مگر سفر یورپ ۱۸۷۰ء کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی آئی وہ یورپ میں جدید معیار تعلیم سے بہت متاثر ہوئے اور مسلمانوں کی تعمیر وترقی کے لیے جدید علوم کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اس نظریے کا اظہار کیا کہ مقامی زبانیں اس قابل نہیں کہ ان میں جدید علوم کی تعلیم دی جا سکے لہٰذا جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم صرف اور صرف انگریزی زبان میں ہی ممکن ہے۔ وہ اس حوالے سے لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے پوری طرح ہم خیال تھے، جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کی تعلیم وتربیت ایسی زبانوں میں کرنے کی بجائے کسی دوسری زبان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں نظام تعلیم کی تبدیلی کے حوالے سے پیش کی جانے والی یادداشت میں لکھا تھا:

> ''تمام طبقے اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان کے اس حصہ کے بسنے والے جو مختلف بولیاں بولتے ہیں، وہ ادبی وعلمی معلومات سے یکسر تہی دامن ہیں۔ پھر اُن کے الفاظ کا ذخیرہ اس قدر کم اور انداز

بیان اس حد تک ناتراشیدہ ہے کہ جب تک اُنھیں کسی اور ذریعہ سے وسیع نہ کیا جائے۔ اُن میں کسی ناقابلِ قدر علمی کام کو منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیز اب بدیہی حقیقت کے طور پر سامنے آ چکی ہے کہ اس ملک کے جو طبقے اعلیٰ تعلیم پانے کے وسائل رکھتے ہیں، اُن کی ذہنی نشوونما دیسی زبانوں کے سوا کسی دوسری زبان کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے۔

''ہم اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہیں کہ ساری قوموں کے لوگ ہماری زبان سے اس حد تک واقف ہیں جس میں وہ بآسانی اُن دقیق اور پیچیدہ مسائل کو سمجھ سکتے ہیں جس سے اس زبان کا دامن بھرپور ہے اور اس کے ذریعے وہ ان ادبی لطافتوں سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہونے کی استعداد رکھتے ہیں جو ہمارے ہاں کے اعلیٰ انشاپردازوں کی تحریروں میں موجود ہیں۔''[۳]

سرسید نے جب تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی تو انھوں نے اپنی رائے اسی حوالے سے اردو اور انگریزی میں لکھ کر شائع کی۔ اس کتابچے میں انھوں لارڈ میکالے سے اتفاق کرتے ہوئے اردو زبان کو تعلیم و تربیت کے لیے ناموزوں قرار دیا اور نام لیے بغیر انگریزی زبان میں ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت کی بات کی۔ انھوں نے تعلیمی حوالے سے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

''ہم علوم مشرقی کی ترقی کے معنی نہیں سمجھتے، نہ علوم مغربی کا دیسی زبانوں کے ذریعے سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک شائع ہونا ممکن جانتے ہیں

''علوم مشرقی کی ترقی اور چھوٹی موٹی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہم کو کیا نتیجہ دیں گی اور ہم کو کون سی عزت و دولت وحشمت و حکومت بخشیں گی؟

''...... یونیورسٹی کالج لاہور، جو پوری یونیورسٹی ہونے والا ہے، بجز اس کے کہ ہم کو سیدھی راہ چلنے سے روکے، ہم کو ہمارے حقوق سے محروم رکھے، ہم کو اس لائق نہ ہونے دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکیں، ہمارے حق میں اور کیا کر سکتا ہے؟...... ہم کو علوم مشرقی کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا صرف ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم کو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جائے...... پس پنجاب یونیورسٹی اگر وہ قائم ہو جائے تو ہمارے حق میں بجز اس کے کہ ہماری اعلیٰ درجہ کی یورپین تعلیم کو برباد کر دے اور اس پالیسی پر عمل کرے جو ہمیں برباد کرنے والی ہے، اور کیا کرے گی؟''[۴]

سرسید احمد خاں نے مقامی زبانوں کو جدید علوم کی تعلیم کے لیے ناموزوں قرار دیا۔ ان کی یہ بات کسی حد تک درست تھی کیونکہ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں شاید کوئی بھی زبان اس وقت تک اتنی وقیع نہیں تھی کہ جدید علوم اس میں پڑھائے جا سکتے، نہ جدید علوم کی کتب مقامی زبانوں میں تھیں۔ اسی لیے سرسید نے مقامی زبانوں پر انگریزی کو ترجیح دی۔ کیونکہ ان کے خیال میں انگریزی زبان میں جدید علوم کی تعلیم کے لیے جو وسعت تھی کوئی مقامی

زبان اس قابل نہ تھی۔لہٰذا سرسید نے کہا:

''اردو زبان، جس کے وسیلہ سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے، اس کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو کیونکہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں، اس زبان کی نسبت ہم کو اول یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں، کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسری یہ کہ وہ زبان فی نفسہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اس میں علمی کتابیں تصنیف ہو سکیں، کیونکہ پہلی بات کا تو علاج ہو سکتا ہے مگر دوسری بات لا علاج ہے۔تیسری یہ کہ آیا وہ ایسی زبان ہے یا نہیں کہ اس میں علوم پڑھنے سے جودت طبع، حدت ذہن، سلاست فکر، ملکہ عالی، قوت ناطقہ، پختگی تقریر اور ترتیب ودلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے؟ ان تینوں باتوں میں سے اردو زبان میں کوئی بات نہیں۔پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اس طریقہ تعلیم کو جو درحقیقت تربیت انسان کو خراب کرنے والا اور خود بخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ہے، بالکل بدل دے اور اس زبان میں تربیت جاری کرے جس سے تربیت کا جو اصلی نتیجہ ہے وہ حاصل ہو۔میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسے اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ہے، جاتی رہے۔صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی زبان کے وسیلہ سے تربیت کرتی ہے اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔''[۵]

سرسید احمد خاں ایک اور موقع پر اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔

''انگریزی، قطع نظر اس کے کہ وہ ہمارے حاکموں کی بھی زبان ہے اور علاوہ علوم حاصل کرنے کے اور بہت سے وجوہ سے ہمارے بکار آمد ہے، ہماری دسترس میں ہے اور اس لیے لازم ہو گیا ہے کہ ہم اسی زبان میں ان علوم کو حاصل کریں۔''[۶]

سرسید احمد خاں مردوں کی تعلیم کے تو حق میں تھے مگر خواتین کی جدید تعلیم کی طرف ان کی کوئی توجہ نہ تھی۔ اس حوالے سے ان کا خیال تھا کہ خواتین کو جدید تعلیم دینے کی ضرورت نہیں۔ان کا خیال تھا کہ اگر موجودہ حالات میں خواتین کو جدید تعلیم دی گئی تو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے اور اس مقصد کے لیے خرچ کی جانے والی رقم اور محنت برباد ہو جائے گی۔سرسید کا خیال تھا کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے قدیم ترین طریقہ کار ہی مفید ہے اور وہ کتب جو ہماری دادیاں اور نانیاں پڑھ آئی ہیں آج بھی خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے مفید ہیں۔اس حوالے سے سرسید کا کہنا تھا:

''حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اُس وقت تک نہ ہو گی جب تک اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے، وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے

کافی ہے۔ جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو کرنا ہے، وہ یہ ہے مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے بندوبست کی جانب کافی توجہ کرے۔ اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیم نسواں کے جاری کرنے کی کوشش کرے گی تو حالت موجودہ میں محض ناکامی حاصل ہوگی اور میری رائے ناقص میں اس سے مضر نتیجے پیدا ہوں گے اور روپیہ اور محنت ضائع جائے گی۔''۷

سر سید کے خیال میں عورتوں کے لیے یہ تعلیم کافی تھی کہ وہ نیک اخلاق اور نیک عادات و خصائل سیکھ لیں، امورِ خانہ داری اور بچوں کی پرورش کی ماہر ہو جائیں، مذہبی عقائد کو جان لیں اور بس۔ سر سید لکھتے ہیں:

''میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم اُن مقدس کتابوں کے بدلے، جو تمہاری دادیاں اور نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانہ کی مروجہ نا مبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانہ میں پھیلتی جاتی ہیں۔ سچی تعلیم نہایت عمدگی سے اُن کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمہاری دادیاں نانیاں پڑھتی تھیں۔ جیسی وہ اُس زمانہ میں مفید تھیں ویسی ہی اس زمانہ میں مفید ہیں۔''۸

سر سید احمد خاں نے عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی مخالفت ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے کی۔ ہندوستان میں عورتوں کی ملازمت کا اس وقت تک کوئی تصور نہ تھا اس لیے سر سید یہ سمجھتے تھے کہ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہیے۔ بعض لوگ جو خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں تھے انھیں مخاطب کرتے ہوئے سر سید نے کہا تھا:

''وہ علوم جن کو اس زمانہ میں یورپ کی تقلید سے لڑکیوں کی تعلیم میں لوگ داخل کرنا چاہتے ہیں 'یورپ کی اور امریکہ کی حالت معاشرت کے خیال سے وہ علوم لڑکیوں کو سکھانے ضرور ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ وہاں عورتیں پوسٹ ماسٹر اور ٹیلی گراف ماسٹر ز یا پارلیمنٹ کی ممبر ہو سکیں لیکن ہندوستان میں نہ وہ زمانہ ہے نہ سینکڑوں برس بعد بھی آنے والا ہے۔''۹

سر سید احمد خاں نے درج بالا وجوہ کی بنیاد پر خواتین کو جدید اعلیٰ تعلیم دینے کی مخالفت کی تھی ہندوستانی عورت کا کام گھریلو ذمہ داریاں اور بچوں کی نگہداشت ہے سو ایسی تعلیم وہ بزرگ خواتین سے حاصل کر لیتی ہیں۔ لیکن سر سید کی مخالفت کرنے والے طبقے نے تاثر دیا کہ سر سید خواتین کو اس قابل ہی نہ سمجھتے تھے کہ انھیں اعلیٰ تعلیم دی جائے۔

سر سید احمد خاں نے مسلمانوں میں جدید مغربی علوم کو فروغ دینے کے لیے علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا۔ یہ کالج ترقی کرتے کرتے آخر کار یونیورسٹی تک پہنچ گیا۔ اس ادارے نے برصغیر پاک و ہند میں جدید مغربی علوم کے حصول میں اہم کردار ادا کیا۔ سر سید نے بہت سے مواقع پر اس کالج کے قیام کی غرض و غایت بیان کی۔ یہ کالج برصغیر کے مسلمانوں میں جدید مغربی علوم کو فروغ دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس حوالے سے سر سید کا بیان ہے:

''اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از رُوئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں۔''۱۰

اسی کے ساتھ ساتھ سرسید نے علی گڑھ کالج کے قیام کے مقصد پر بات کرتے یہ بھی کہا کہ کالج قائم کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں دوستانہ مراسم پیدا ہوں اور فریقین کے مابین جو تعصب اور نفرت ہے وہ دور ہو۔ اسی حوالے سے سرسید کا خیال تھا کہ جب تک دونوں اقوام میں اعتماد کی فضا قائم نہیں ہو گی مسلمانان ہند خسارے میں رہیں گے۔ اسی لیے ان کا کہنا تھا:

> ''میرا سب سے بڑا مقصد کالج کے قائم کرنے سے یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور انگریزوں میں دوستانہ راہ و رسم پیدا ہو اور آپس کا تعصب اور نفرت دور ہو۔''[۱۱]

سرسید نے اس حوالے سے مزید کہا:

> ''مجھے اُمید ہے کہ تم اِس نشان کو اپنے دلوں میں بھی نقش کرو گے اور یاد رکھو گے کہ اس کالج کا بڑا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد ہو اور وہ ایک دوسرے کے اغراض میں یک جان اور دو قالب ہو کر، جیسا کہ اس نشان میں کریسنٹ اور کراس یک جان و دو قالب ہیں، شریک رہیں گے۔''[۱۲]

سرسید دراصل مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان کی نفرت ختم کر کے مسلمانوں کے حکومت کے ساتھ تعلقات میں بہتری کے خواہاں تھے۔ ان کے خیال میں حکومت اور مسلمانوں کی دوری مسلمانوں ہی کو نقصان پہنچائے گی۔ علی گڑھ کالج کے قیام کے مقاصد پر بات کرتے ہوئے سرسید نے یہ کہا:

> ''ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کی لائق و کارآمد رعایا بنانا اور اُن کی طبیعتوں میں اس قسم کی خیر خواہی پیدا کرنا جو ایک غیر سلطنت کی غلامانہ اطاعت سے نہیں بلکہ عمدہ گورنمنٹ کی برکتوں کی اصل قدر شناسی سے پیدا ہوتی ہے۔''[۱۳]

علی گڑھ کالج نے اپنے قیام کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ مقبولیت حاصل کی جو بہت کم اداروں کو مل سکی۔ سرسید اس ادارے کی ترقی اور روز بروز بڑھتی طلبہ کی تعداد سے بھی بہت خوش تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کالج نے اپنے قیام کے بیس سال کے اندر جو تعداد طلبہ میں ترقی کی ہے ہم کو اس کی توقع نہ تھی۔ مزید یہ کہ اس ادارے نے انگریزی حکومت اور مسلمانانِ ہند کے مابین فاصلے کم کرنے کے لیے جو کوشش کی اس کے بھی خاطر خواہ نتائج سامنے آئے۔ اس بات پر انگریزی حکام نے بھی خوشی کا اظہار کیا کہ اس کالج کے فارغ التحصیل انگریزی حکومت کے سچے خیر خواہ ہیں۔

علی گڑھ کالج نے بلا شبہ بہت ترقی کی اور انگریزی حکومت اور مسلمانوں کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عام لوگ اس ادارے کے نتائج سے مطمئن نہیں تھے۔ سرسید کے بہت سے قریبی ساتھیوں کا بھی یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج وہ نتائج دینے میں ناکام رہا جن کی اس ادارے سے توقع کی جا رہی تھی۔ مولانا حالی نے اس حوالے سے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''اِن نتائج سے محمڈن کالج کی کوئی ایسی خصوصیات ظاہر نہیں ہوتی جس کی رُو سے اس کو ہندوستان

کے اور کالجوں پر ترجیح دی جا سکے یا اس کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھا جائے۔ سوا اس کے کہ اس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد کسی قدر زیادہ پائی جاتی ہے، کوئی تفاوت تعلیم اور نتائج تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا۔ نہ یہاں کے طالب علموں نے آج تک فضیلت اور علمی لیاقت میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کے نتائج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ پس تاوقتیکہ کوئی وجہ امتیاز کی نہ بتائی جائے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی انسٹی ٹیوشن نہیں ہے۔''[۱۴]

اس بحث کے بعد ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ سر سید کے پیش نظر علی گڑھ کالج کے قیام کا مقصد مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم بھی تھا اور انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلوں کو کم کرنا بھی۔ اس زمانے میں کہ جب مسلمانان ہند اپنا اقتدار کھو بیٹھے تھے اور ان کے اور انگریزوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم نہ تھا ایسی کسی کوشش کا کیا جانا بے حد ضروری تھا تا کہ دونوں اقوام ایک دوسرے کے قریب آسکیں اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ سکیں۔ مزید یہ کہ چونکہ مسلمان عسکری طور پر کمزور تھے اس لیے حالات کے ساتھ سمجھوتہ ہی مسئلے کا حل تھا اور اسی کے لیے سر سید احمد خاں نے کوشش کی۔ کیونکہ حکومتِ وقت سے ٹکراؤ کا نقصان بہ ہر حال مسلمانان ہند کو ہی ہوتا اور ہندو اس صورتحال کا پوری طرح فائدہ اٹھاتے۔ لہٰذا سر سید نے جو کہا وہ تقاضائے وقت کے عین مطابق تھا۔ اسی وقت اگر سر سید بھی دوسرے بہت سے مسلمانوں کی طرح انگریزی حکومت کی مخالفت اور ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرتے تو مسلمانانِ ہند جدید تعلیم سے محروم رہ جاتے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہ ہوتا۔ تاہم سر سید دور بین انسان تھے اور ان کی کاوشوں کے دور رس نتائج سامنے آئے۔ اس حوالے سے صفدر سلیمی لکھتے ہیں:

''اگر سر سید کا شاہکار (مدرستہ العلوم) سامنے نہ آتا تو اس ملک کی فضاؤں میں نہ محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں کے نعرہ ہائے حُریت سنائی دیتے، نہ اقبال کے حیات آفریں نغموں کی گونج فردوسِ گوش بنتی اور نہ وہ قائداعظم میدانِ قیادت میں نظر آتا جس کا تدبر برطانوی سامراج اور ہندو سامراج کے لیے ملک الموت ثابت ہوا اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم مملکت کا نقطۂ آغاز۔''[۱۵]

ریاض الرحمٰن شروانی نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس برصغیر میں تو مسلمان شودروں سے بدتر ہوتے، اگر سر سید نے ان کی تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں رہنمائی نہ کی ہوتی۔ سر سید کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جتنا بڑا کارنامہ پچھلے سوا سو، ڈیڑھ سو برسوں میں کسی اور کا نہیں۔''[۱۶]

سر سید احمد خاں نے مسلمانانِ ہند کو جدید تعلیم سے روشناس کرایا۔ ان کی یہ خدمت کارِ عظیم ہے مگر اس حوالے سے یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ سر سید نے ہمیشہ روٴسا اور امرا کے بچوں کی تعلیم کی بات کی۔ کسی غریب اور

نچلے طبقے کے مسلمانوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی بات نہ کی۔ انھیں ہمیشہ امرا اور رؤسا کے لڑکوں کی تربیت کی فکر رہی۔ وہ اس بات پر پریشان رہتے تھے کہ امرا اور رؤسا کے لڑکوں کا اخلاق نچلے طبقے کے لڑکوں کے ساتھ یا بازاری لڑکوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے بگڑا جاتا ہے اور امرا اور رؤسا اس جانب کوئی توجہ نہیں دیتے۔ مزید یہ کہ وہی لڑکے جب بڑے ہوتے ہیں تو وہی بازاری اور نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے لڑکے ان کے مصاحب بن جاتے ہیں۔ اس صورتحال سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ روسا اور امرا کے بچوں کی تعلیم و تربیت ان عام بچوں سے الگ رکھ کر کی جائے۔ سرسید کا خیال تھا کہ امرا و روسا کے بچے محنت سے عمدہ نتائج دے سکتے ہیں لہٰذا پہلے ان پر محنت کی جائے اور ایک ایسا طبقہ وجود میں آ جائے جو بعد ازاں قومی تربیت میں ممد و معاون ہو۔ وہ اخلاق و تربیت کے جس مرحلے پر فائز ہیں اس سے اوپر جانے کے بجائے نیچے آ رہے ہیں۔ سرسید کو اس بات پر دکھ تھا۔ امرا اور روسا کے بچوں کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''میں نے بڑے بڑے امیروں کے بچے دیکھے ہیں۔ وہ نوکروں کے لونڈوں اور اگر وہ نہیں تو بازاری لونڈوں، کی صحبت اُٹھاتے ہیں۔ گالی گلوچ، بُرے الفاظ، بد اخلاقی کی باتیں، خراب عادتیں سنتے، دیکھتے اور سیکھتے ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔''۱۷

سرسید اس حوالے سے امرا سے یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بچوں کی تربیت کے حوالے سے کیا کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں پوچھتا ہوں کہ آپ صاحبوں نے اپنی اولاد کے اخلاق درست کرنے کی کیا تدبیر کی ہے؟ کیا آپ کے لڑکوں کے ساتھ آپ کے سائیس کے لونڈے نہیں کھیلتے یا ماماؤں اور اُن کے لڑکوں میں آپ کے لڑکے نہیں کھیلتے؟ کیا اپنے لڑکوں کو بازاری لونڈوں کی صحبت سے بچانے کے لیے آپ کچھ فکر فرماتے ہیں؟ ان سب باتوں کا جواب یہ ہے کہ کچھ نہیں۔ وہی بد اخلاقی، بد زبانی، کمینہ عادت جو اُن کمینے لونڈوں سے آپ کے لڑکے سنتے اور دیکھتے ہیں، وہی وہ بھی سیکھتے ہیں اور وہی بد اخلاقی اُن میں اثر کر جاتی ہے۔''۱۸

امرا اور رؤسا کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انھوں نے یہ حل تجویز کیا کہ ان بچوں کو عام بچوں سے الگ رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کی جائے۔ اس کے لیے انھوں نے مدرستہ العلوم کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس کا قیام لازمی قرار دیا تاکہ امرا کے بچے بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر زندگی کی اعلیٰ اقدار سیکھیں۔ اس حوالے سے سرسید کا یہ بھی کہنا تھا کہ انگلستان میں تمام بڑے لوگوں کے بچے بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر ہی اعلیٰ تربیت حاصل کرتے ہیں۔

سرسید احمد خاں پر یہ اعتراض بھی اٹھایا جاتا ہے کہ انھوں نے امرا اور رؤسا کے بچوں کے لیے تو جدید اعلیٰ تعلیم کو لازمی قرار دیا مگر غریب افراد کے بچوں کے لیے انھوں نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا، اس حوالے سے ان کا یہ خیال تھا کہ جس حیثیت اور درجے کے یہ لڑکے ہیں ان کو انگریزی پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ان لڑکوں کے

لیے صرف اتنی ہی تعلیم کافی ہے کہ انھیں لکھنا پڑھنا اور ضروری حساب کتاب آ جائے۔ مزید یہ کہ کچھ مذہبی تعلیم دے دی جائے۔ اس طرح دیہاتی بچوں کی تعلیم کے حوالے سے بھی سرسید نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا کہ انھیں دیسی زبان میں ''بدرجہ اعتدال'' لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جائے۔

سرسید کی تمام تعلیمی کوششوں کا مطلب یہ ہوا کہ امرا کے بچوں کے لیے تو اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا جائے جو ابتدائی تعلیم رکھتے ہیں غربا اور نچلے طبقے کے بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم یعنی دیسی زبان میں درجہ اعتدال تک تعلیم کافی ہے اس حوالے سے حفیظ ملک لکھتے ہیں:

> ''سرسید کی اس تمام تگ و دو کا مطلب یہ ہوا کہ غربا کے لڑکے تو ادنیٰ تعلیم بھی نہ حاصل کر پائیں اور اعلیٰ درجے تک کی کل تعلیم کے حقدار صرف امیر زادے ہوں۔ جب مالی لحاظ سے معاشرت پر پہلے سے حاوی اس طبقے کے افراد تعلیم پا کر حکومت کے اعلیٰ کلیدی عہدوں پر فائز ہو جائیں تو حاکمانہ رویے کے ساتھ ادنیٰ طبقے کے استحصال پر (جو ہمارے ہاں طبقاتی امتیاز کے شعور کا لازمی نتیجہ ہے) خوب قادر ہو سکیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے بعد غریب لڑکوں پر ادنیٰ تعلیم کے دروازے کھولے جائیں تا کہ وہ بڑے ہو کر وقت کی ضرورت کے مطابق ان کے بہتر خدمت گار ثابت ہو سکیں۔''[۱۹]

حفیظ ملک کی یہ رائے تعصب پر مبنی ہے ورنہ سرسید تمام طبقوں کی فلاح و بہبود ان کی لیاقت اور ذہنی سطح کے مطابق چاہتے تھے۔ اس کے باوصف بعض لوگوں کے خیال میں سرسید کی تعلیمی پالیسی میں طبقاتی فرق بھی تھا۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ میں بورڈنگ ہاؤس قائم کیا تو اس میں تین درجے مقرر کیے۔ ان درجوں میں باقاعدہ تفریق پائی جاتی تھی اور طالب علموں کے اندر بھی یہ طبقاتی احساس موجود تھا۔ سرسید کی تعلیمی پالیسی کا یہ ایک کمزور پہلو تھا کہ ادنیٰ، کمتر اور نچلے درجے کے لوگ بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اونچے عہدوں پر فائز ہو جائیں۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان برصغیر کے لوگوں میں ذات پات کے نظام سے وہ بخوبی آگاہ تھے اور سمجھتے تھے کہ اعلیٰ طبقے کے لوگ گوارا نہیں کریں گے کہ ادنیٰ طبقے کے لوگ ان پر حکومت کریں۔ لہٰذا سرسید نے تمام طبقوں کی تربیت کے لیے الگ الگ مراحل مرتب کیے۔ اس حوالے سے انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:

> ''کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجے کا آدمی، خواہ اُس نے بی اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کی، اور گو وہ لائق بھی ہو، اُن پر بیٹھ کر حکومت کرے؟ اُن کے مال، جائیداد اور عزت پر حاکم ہو؟ کبھی نہیں، کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا۔''[۲۰]

سرسید کی تعلیمی تحریک نے ایک خاص طبقے یعنی اشرافیہ کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی مگر مدرستہ العلوم علی گڑھ کے محدود مالی وسائل کی وجہ سے نچلے طبقے کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دے سکے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اعلیٰ طبقے کے طلبہ اپنے تعلیمی اور بورڈنگ کے اخراجات برداشت کر سکتے تھے مگر غریب اور نچلے طبقے کے لیے

ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ادارے سے نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان تعلیم حاصل نہ کر سکے اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ادنی طبقے کے پڑھے لکھے آدمی کو کہ جب وہ مال و جائیداد پر حاکم ہوا سے کوئی بھی برداشت نہیں کرے گا۔

حوالہ جات:

۱۔ سرسید احمد خاں، مسافرانِ لندن، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، (لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۱ء)، ص ۱۹۷

۲۔ مولوی عبدالحق، سر سید احمد خاں۔حالات و افکار، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۳۹

۳۔ لارڈ میکالے، میکالے کا نظریہ تعلیم (ترجمہ عبدالمجید صدیقی) (کراچی: روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، ۱۹۶۵ء)، ص ۴۵

۴۔ سرسید احمد خاں، مقالاتِ سر سید، مرتبہ شیخ اسماعیل، پانی پتی، (لاہور: مجلس ترقی ادب (جلد ہشتم) ۱۹۶۲ء)، ص ۳۶

۵۔ سرسید احمد خاں، بحوالہ، حیاتِ جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، ص ۸۵

۶۔ سرسید احمد خاں، مجموعہ لیکچرز و اسپیچیز، مرتبہ امام الدین گجراتی، (لاہور: مصطفائی پریس ۱۹۰۰ء)، ص ۴۳۰

۷۔ ایضاً، ص ۴۷۵

۸۔ سرسید احمد خاں، سفرنامہ پنجاب، مرتبہ، سید اقبال علی، (علی گڑھ: انسٹی ٹیوٹ پریس، ۱۸۸۴ء)، ص ۲۵

۹۔ سرسید احمد خاں، مجموعہ لیکچرز و اسپیچیز، ص ۳۸۴

۱۰۔ نواب محسن الملک (مرتب)، ایڈریس اور اسپیچیں متعلق ایم اے او کالج، (انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۹۹۸ء)، ص ۳۲

۱۱۔ روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجلاس نہم) مطبع، (آگرہ: مفیدِ عام، ۱۸۹۵ء)، ص ۱۷۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۹۵

۱۳۔ ایڈریس اور اسپیچیں، ص ۹۴

۱۴۔ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، (لاہور: نیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۶ء)، ص ۸۴

۱۵۔ صفدر سلیمی، پاکستان کا معمار اوّل، (لاہور: ادارہ طلوع اسلام، ۱۹۶۷ء)، ص ۱۷

۱۶۔ ریاض الرحمٰن شروانی ''سرسید احمد خاں ایک ریفارمر''مشمولہ کانفرنس گزٹ علی گڑھ:اکتوبر ۲۰۰۵ء،ص ۱۵
۱۷۔ سرسید احمد خاں، مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچیز،ص ۱۵۲
۱۸۔ ایضاً،ص ۱۵۲
۱۹۔ حفیظ ملک،سر سید احمد خان ایجوکیشنل فلاسفی (مرتبہ)(اسلام آباد:نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ،۱۹۸۹ء)،ص ۱۴۹
۲۰۔ سرسید احمد خاں،مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچیز،ص ۳۴۶

مآخذ:

۱۔ الطاف حسین حالی،حیاتِ جاوید،لاہور:نیشنل بک ہاؤس،۱۹۸۶ء۔
۲۔ حفیظ ملک،سر سید احمد خان ایجوکیشنل فلاسفی (مرتبہ)اسلام آباد:نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ،۱۹۸۹ء۔
۳۔ سرسید احمد خاں،سفرنامہ پنجاب،مرتبہ،سید اقبال علی،علی گڑھ:انسٹی ٹیوٹ پریس،۱۸۸۴ء۔
۴۔ سرسید احمد خاں،مجموعہ لیکچرز و اسپیچیز ،مرتبہ امام الدین گجراتی،لاہور:مصطفائی پریس ۱۹۰۰ء۔
۵۔ سرسید احمد خاں،مسافرانِ لندن،مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی،لاہور:مجلس ترقی ادب ۱۹۶۱ء۔
۶۔ سرسید احمد خاں،مقالاتِ سر سید ، مرتبہ شیخ اسماعیل،پانی پتی،لاہور:مجلس ترقی ادب (جلد ہشتم) ۱۹۶۲ء۔
۷۔ صفدر سلیمی،پاکستان کا معمار اوّل،لاہور:ادارہ طلوع اسلام،۱۹۶۷ء۔
۸۔ لارڈ میکالے، میکالے کا نظریہ تعلیم (ترجمہ عبدالمجید صدیقی) کراچی:روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، ۱۹۶۵ء۔
۹۔ مولوی عبدالحق، سر سید احمد خاں ۔حالات و افکار ،کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۰ء۔
۱۰۔ نواب محسن الملک(مرتب)،ایڈریس اور اسپیچیں متعلق ایم اے او کالج ،انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ ۱۹۹۸ء۔

☆☆☆